ڈاکٹر عطش دُرّانی

خانوادۂ ٹیپو کی ادبی خدمات

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد جب میجر ایلن محل میں داخل ہوا تو سلطان کے دو بیٹے عبدالخالق (دس سال) اور معز الدین (گیارہ سال) موجود تھے۔شہزادہ فتح حیدر قلعہ سے باہر تھا۔ ٹیپو سلطان کی سلطنت ہندو راج کے لڑکے کو دے دی گئی اور اس کے خاندان والوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ جولائی ۱۸۰۶ء میں ویلور میں بلوہ ہوا اور بہت سے انگریز مارے گئے تو الزام خانوادۂ ٹیپو پر لگا اور اب انھیں پھر سے جلاوطن کر کے کلکتہ کے قریب ایک جنگل ''ٹالی گنج'' میں بسایا گیا۔ جہاں اس کی نسلوں نے فارسی اور اردو میں بہت سی خدمات انجام دیں۔

''مقالاتِ فرید'' کلکتہ کے مصنف جی ایس فرید لکھتے ہیں:

> کلکتہ کے جلاوطن شہزادوں میں سب سے زیادہ دور اندیش، دانش منداور انگریزوں کے حلقے میں مقبول ٹیپو سلطان کے گیارھویں بیٹے غلام محمد سلطان تھے۔انھوں نے ملکہ وکٹوریہ سے لندن جا کر ملاقات کی۔غلام محمد ٹرسٹ قائم کیا''

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے ''ٹالی گنج'' کے ہنروروں کی اردو خدمات پر مفصل کتاب لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''کلکتہ سے کچھ دور ایک طرف مٹیا برج کا علاقہ تھا جو آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر کے بس جانے سے لکھنؤ ثانی بن گیا تھا اور پھر کلکتہ کے جنوبی کونے میں یہی ٹالی گنج ہے جہاں میسور کے شہزادوں نے علم وادب کی نئی محفل سجائی تھی۔'' واجد علی شاہ کے مٹیا برج اور میسور خاندان کے ٹالی گنج میں انیسویں صدی ہی میں ایک علمی و

ادبی رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ اس رشتے کو استوار کرنے کا شرف سید علی حیدر صاحب حیدر لکھنوی کو حاصل تھا جو بعد میں ادبی دنیا میں نظم طبا طبائی کے نام سے مشہور زمانہ ہوئے''۔

۱۸۸۳ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ اختر سے کیے گئے ایک معاہدے کے تحت شہزادگان اودھ کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جسے عام طور پر ''شاہی مدرسہ'' یا ''مدرسہ شاہ اودھ'' کہا گیا۔ اس مدرسے میں جسٹس امیر علی کی سفارش پر حکومت وقت نے سید علی حیدر لکھنوی (نظم طبا طبائی) کا تقرر بطور استاد عربی کیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد حکومت نے یہ مدرسہ بند کر دیا جس سے حیدر لکھنوی کی ملازمت جاتی رہی اور وہ کلکتہ سے حیدر آباد (دکن) چلے گئے جہاں جا کر وہ دنیائے علم و ادب میں نظم طبا طبائی ہوئے۔ اس شاہی مدرسہ میں اودھ گھرانوں کے شہزادوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کا گھرانہ، ٹالی گنج کے شہزادے بھی تعلیم پاتے تھے اور حالانکہ اس مدرسہ کا نام واجد علی شاہ کے نام پر رکھا گیا تھا کیونکہ یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن یہ مدرسہ مٹیا برج کے علاقے میں نہیں بلکہ ٹالی گنج کے علاقے میں قائم تھا جس کی وجہ سے ہم کئی قدیم تصانیف میں اس مدرسہ کے نام کے ساتھ مقام ٹالی گنج پاتے ہیں مثلاً مولوی سید علی نقی جون پوری کی تصنیف 'تذکرۃ المعصومین' (جو ۱۸۸۷ء میں مٹیا برج کے رونق المطابع میں چھپی) کے پیش لفظ میں مقام یوں درج ہے............''مدرسہ سلطان اودھ، مقام ٹالی گنج، کلکتہ''............

طبا طبائی کے شاگردوں میں نہ صرف اودھ کے شاہی خاندان، مٹیا برج کے رؤسا اور ان کے گھر کے افراد شامل رہے ہیں بلکہ میسور خاندان ٹالی گنج کے شہزادے اور دیگر لوگ بھی ان کے شاگرد رہے ہیں مثلاً صاحبزادہ محمد ابراہیم شاہ رسا، منشی تمیز الدین احمد اشرف، سید فتح علی فرخ، صاحبزادہ احمد شاہ کیوان، آغا مرزا علی نجم، منشی نثار حسین نثار

• مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

وغیرہ سب ہی نظم طبا طبائی کے شاگرد تھے۔ ان شعرائے ٹالی گنج کا ذکر آگے چل کر اس تذکرہ میں کیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نظم طبا طبائی نے کلکتہ سے حیدرآباد (دکن) چلے جانے کے بعد مٹیا برج کے شعراء پر تو قلم اٹھایا ہے لیکن انھوں نے میسور گھرانے یا ٹالی گنج کے شعراء کے سلسلے میں نہیں لکھا جس کی وجہ سے ہم ٹالی گنج میں ان کے شاگردوں کے سلسلے میں آج کچھ نہیں جانتے۔ نظم طبا طبائی کے سلسلے میں اب تک جو تحقیقی کام ہوا ہے اور تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں بھی نظم طبا طبائی کے قیام مٹیا برج اور ٹالی گنج کے شاگردوں کا ذکر موجود نہیں ہے۔ بہر حال نظم طبا طبائی کا تذکرہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ جس شاہی مدرسہ کے مدرس تھے۔ وہ مدرسہ ٹالی گنج کے علاقے میں قائم تھا اور ٹالی گنج کے کئی شعراء ان سے مشورہ سخن کرتے تھے نیز وہ اکثر و بیشتر میسور گھرانے کے اپنے شاگردوں کے یہاں آتے جاتے تھے اور ٹالی گنج کے شہزادے اپنے دولت کدوں پر جو مشاعرے منعقد کرتے رہے تھے ان میں سے چند میں وہ شریک بھی رہے۔ اس طرح مرکزی کلکتہ اور مٹیا برج میں آج بھی شعراء کی کوئی کمی نہیں ہے، صرف جو اجڑ گیا ہے تو وہ ٹالی گنج ہے...... ۱۸۸۷ء میں شاہی مدرسہ بند ہو جانے کے بعد نظم طبا طبائی تو حیدرآباد چلے گئے لیکن جو چراغ انھوں نے ٹالی گنج میں روشن کیا تھا اس کی روشنی ایک زمانہ تک برقرار رہی .... اور صرف نظم طبا طبائی ہی کیوں، ٹالی گنج کے بعض شہزادوں کو تو مرزا اسد اللہ خان غالب کے شاگرد ہونے اور ان سے خط کتابت کرنے کا فخر بھی حاصل رہا ہے۔

ٹیپو سلطان کے شہزادے یقیناً خالی ہاتھ میسور سے کلکتہ نہیں آئے تھے۔ وہ قیدی تھے لیکن ''شاہی قیدی .... اور ان کے ساتھ کئی سو ملازمین بھی آئے تھے وہ سب اپنے ساتھ کچھ مال و دولت اور قیمتی ہیرے و جواہرات ضرور لائے تھے، اور دوسری طرف، بہت کم ہی کیوں نہ ہو، انگریزی حکومت سے ان کے لیے پنشن مقرر تھی۔ پھر ٹالی گنج میں اس خاندان کے لیے کافی زمین دی گئی تھی۔ لہذا جب آدمی کے پاس کھانے پینے کے لیے ہو

اور کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہوتو آدمی بے کار کب تک رہ سکتا ہے؟ اس کا وقت کیوں کر کٹے؟ چند برسوں تک شہزادوں کو افسوس ضرور رہا لیکن وہ سب مجبور تھے اور آخر کار وقت نے مرہم کا کام کیا اور ان کو صبر کا سبق پڑھا دیا اور وہ اپنا اپنا دل بہلانے میں لگ گئے۔ یقیناً ٹیپو سلطان کے فرزند کو اس کا غم رہا ہوگا کہ وہ اب حکمران نہیں رہے اور انھوں نے چونکہ اپنے والد بزرگوار کی شان وشوکت اور عوام کی نظروں میں ان کی عزت واحترام کو دیکھا تھا، اس لیے ان کے دلوں میں ان ایام کے نقوش باقی تھے لیکن ٹیپو سلطان کے فرزندوں کے بعد کی نسلیں؟ وہ نسلیں جنھوں نے ٹالی گنج میں آنکھیں کھولی تھیں اور جن کے پاس روپیہ بھی تھا، حکومت کی طرف سے پرنس، یا نواب کے خطابات بھی ملے تھے اور کچھ جائیداد اور پنشن بھی .... ایسے شہزادے جنھوں نے صرف انگریزی تہذیب ہی کو دیکھا تھا، انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ ہند پڑھی تھی اور غلامی کے ماحول میں پرورش پائی تھی جن کی نظروں میں اپنے دادا پردادا کی باتیں محض کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ تو زمانے کی ہوا کا ساتھ دینے لگے، اور یہی فطری بھی ہے، (رنجن بھٹاچاریہ تذکرہ ٹالی گنج کے شعراء کلکتہ ۱۹۹۲ء پیش لفظ)

ڈاکٹر محمد منصور عالم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''سلطان ٹیپو کے صاحبزادوں میں سلطان شکر اللہ کو بحیثیت شاعر کافی شہرت ملی۔ انھوں نے فنون لطیفہ اور علم وہنر سے اپنی دلچسپی کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھیں ہر طرح فروغ واستحکام بھی بخشا۔ ٹیپو کی طرح سلطان شکر اللہ بھی علم و دانش کے شیدائی تھے زبان وادب کا اعلیٰ ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے شکر اللہ اپنے دولت کدے پر علم وادب کی محفلیں سجانے لگے اس طرح ان کا گھر شعراء وادباء اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ خود ایک اچھے اور باذوق شاعر تھے اور اپنے والد کی طرح

فارسی کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے شعر گوئی کے ذوق کو سنوارنے اور بلند کرنے میں قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ وہ نہایت نکتہ سنج اور شعر فہم تھے۔ ان کی داد و تحسین سے شعراء کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے انھوں نے اپنی ذہانت اور فنی صلاحیت کے بل بوتے پر اپنے شاگردوں کی ایک بھیڑ جمع کر لی تھی جو بلاناغہ ان کے یہاں حاضری دیا کرتے اور اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ خود سلطان محمد بشیر الدین توفیق اور ان کے بھائی سلطان اعظم الدین تخلص بہ سلطان عبدالرحیم تمنا گورکھپوری شہزادہ شکر اللہ کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے'' (پندرہ روز ''مغربی بنگال'' کلکتہ اگست ۲۰۰۰ء، ص ص: ۱۴۵، ۱۴۶)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے شکر اللہ کے بیٹے شہزادہ بشیر الدین توفیق کو فارسی اردو کا بہت بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاہزادہ بشیر الدین متخلص بہ توفیق، ٹیپو سلطان کے بیٹے شاہزادہ شکر اللہ سلطان (وفات ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۳۷ء) کے فرزند نیک تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے نظم و نثر میں دست گاہ رکھتے تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے اپنی سوانح عمری میں شہزادہ بشیر الدین توفیق اور شہزادہ اعظم الدین سلطان، دونوں کو اپنا دوست لکھا ہے اور ان دونوں شہزادوں کے ساتھ مولوی عبداللہ عبیدی کو بھی عبدالرحیم گورکھپوری کا شاگرد لکھا ہے''۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ نساخ کا بیان غلط ہے لیکن بعد میں توفیق مرزا غالب سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور بطور شاگرد غالب ہی وہ جانے گئے۔ مالک رام صاحب نے ''تلامذۂ غالب'' میں توفیق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ توفیق کو دیکھنے والے ان کے

اخلاق حمیدہ اور صفات برگزیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ ''اردو معلی'' میں مرزا غالب کے جملہ پانچ خطوط (حصہ اول میں تین اور حصہ دوم میں دو) شہزادہ بشیرالدین کے نام ہیں، جن سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ توفیق مرزا غالب سے مشورہ سخن لیتے رہے ہیں۔ غالب کے ان خطوط کا انداز بیان ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ رئیسوں اور نوابوں کے نام خطوط لکھا کرتے تھے۔ مثلاً ''حضرت پیر و مرشد برحق سلامت.......... تقصیر معاف میں مدعی اور آپ مدعا علیہ بھی اور حاکم بھی.......... بندہ پرور مہربانی نامہ آیا، سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا..........'' وغیرہ جیسے الفاظ ہم توفیق کے نام خطوط میں بھی پاتے ہیں۔ ۱۶ جون ۱۸۶۷ء کے خط میں غالب نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک تصویر کھینچوا کر بھی توفیق کو بذریعہ ڈاک بھیجی تھی۔ اس خط میں غالب یہ بھی لکھتے ہیں کہ.......... ''اب جب آپ لفافہ بھیجیں گے تو مطالب باقی کا جواب مع اوراق اشعار بھیجوں گا..........'' جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ توفیق نے اپنا کلام بغرض اصلاح روانہ کیا تھا۔ نواب رامپور کے نام غالب نے جس مشہور شعر کا استعمال کیا ہے، وہی شعر انھوں نے توفیق کے نام بھی ایک خط میں استعمال کیا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

توفیق کے اخلاق، عادات، علم دوستی، سخن فہمی اور نکتہ سنجی وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لالہ سری رام مولف ''تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانہ جاوید'' نے لکھا ہے:

''خدا کے فضل سے حضرت توفیق اپنے والد ماجد کی مانند علم و فضل و اخلاق حمیدہ اور صفات برگزیدہ رکھتے تھے اور نکتہ سنجی اور موزونی طبع میں فخر خاندان تھے۔ تاریخ خوب کہتے تھے.......... غالب کے دوستانہ تعلقات ان کے ساتھ مربوط تھے۔ نظم و نثر فارسی اردو دونوں میں دستگاہ تھی۔ چنانچہ دیوان ہزبر کی تقریظ و تاریخ خوب کہی ہے۔ ایک مہربان

نے کلام بھیجنے کا پختہ وعدہ کیا تھا مگر باوجود تقاضا ارسال نہ کیا، بدرجہ مجبوری صرف اندراج حال پر قناعت کی۔ سلطان بشیرالدین کی زندگی کا بڑا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا اور وہیں ۱۸۷۰ء کے قریب انتقال کیا''۔

توفیق کے سن ولادت کا علم حاصل نہ ہو سکا لیکن اتنا ضرور ہے کہ جن دنوں مرزا غالب کلکتہ آئے ہوئے تھے، ان دنوں توفیق یا سلطان سے غالب کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، بہر حال بعد میں مرزا غالب سے توفیق خط و کتابت کرتے رہے اور مشورہ سخن لیتے رہے ہیں اور توفیق کا یہ سب کلام بزبان فارسی رہا ہے۔ شہزادہ بشیرالدین توفیق کو غالب نے چند خطوط فارسی میں بھی لکھے تھے لیکن اب تک صرف ایک فارسی خط ہی منظر عام پر آیا ہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو مولوی نعمان احمد ساکن مہیوہ ضلع سیتاپور کے نام مرزا غالب اپنے خط میں لکھتے ہیں .... ''برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیے ہیں۔ اب شہزادہ بشیرالدین نبیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے''۔

لالہ سری رام نے توفیق کے انتقال کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''۱۸۷۰ء کے قریب انتقال کیا''، لیکن یہ انھوں نے اندازاً لکھا ہے۔ غالب کے اس شاگرد کا انتقال ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء ٹالی گنج میں ہوا۔ توفیق کی آخری آرام گاہ میسور خاندان کا قبرستان نزد کالی گھاٹ ٹرام ڈپو (۱/۵۷ ستیش مکھر جی روڈ) کلکتہ میں ہے لیکن اب اس شاہی قبرستان کی حالت نہایت خراب ہے اور یہاں چند لاریوں کے گیراج وغیرہ بھی بن گئے ہیں۔ اردگرد علاقے کے بچوں کے لیے اب یہ قبرستان کھیل کود کا ایک میدان ہے۔ مختلف قبروں پر جو سنگ مرمر یا دیگر قیمتی پتھروں پر نام اور تاریخ وفات وغیرہ کندہ تھے۔ ان سب لوح مزار کا اب کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے، لہذا کون سی قبر کس کی ہے کہنا آج ممکن نہیں ہے۔ شہزادہ بشیرالدین توفیق کی اولاد میں سے ایک شہزادے کا نام امیرالدین تھا۔

لالہ سری رام ''خمخانہ جاوید'' میں توفیق کا نمونہ کلام اپنے تذکرہ میں کیوں پیش نہ کر سکے اس کا بیان اوپر درج کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر منصور عالم کے بقول '' شہزادہ شکراللہ کی وفات (۲۴ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۳۷ء) کے بعد خانوادہ ٹیپو کا جو فرد علم وادب کی دنیا میں ممتاز ہوا، وہ شہزادہ بشیرالدین توفیق تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے جید عالموں اور قادرالکلام فارسی شعراء میں ہوتا تھا۔ بقول مالک رام'' وہ عربی وفارسی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے''۔ ان کے فارسی اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فارسی زبان پر کتنا عبور حاصل تھا۔ وہ کس روانی کے ساتھ فارسی میں اشعار کہتے تھے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں کس قدر پختہ تھیں۔

مشہور شاعر نساخ انکی فارسی دانی، علمی بصیرت اور ادب نوازی سے کافی متاثر تھے اور ان سے عقیدت وارادت بھی رکھتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر توفیق کے دولت کدہ پر منعقدہ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں بشیرالدین توفیق کی ایک مثنوی '' نہال خیال'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ توفیق شاعری سے متعلق فرماتے ہیں:

'' در ہجو سرائی ید طولی دارد۔ سخنانش سادہ و پرکار رواشت و بعضی ازان سہل ممتنع''

نساخ کے قول کے مطابق توفیق ہجونگاری میں کافی دستگاہ رکھتے تھے لیکن اپنی کتاب میں انھوں نے ان کی کوئی ہجو نقل نہیں کی۔ اس لیے یہ علم نہ ہوسکا کہ توفیق نے کس کی ہجو لکھی ہے۔ نساخ کے علاوہ مشہور شاعر اور عالم مولانا عبیداللہ عبیدی (۱۸۸۵۔۱۸۳۵ء) بھی ان کے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے بھی اپنی خودنوشت '' داستان عبرت بار'' میں توفیق کی شعری اور فنی صلاحیتوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں:

با بندہ خیلی محبت داشتند، بندہ ہر روز عصری خدمت ایشان می رفتم و مذاکرہ شعر وسخن داشتم۔ ایشان توفیق تخلص می کنند نہ تنہا در فن سخن سازی دری و

تازی یگانۂ عصر اندا بلکہ در دانستن حقائق محاورات و فارسی و نکات ادبیہ عربی مثالی ندارند''

اپنی اس کتاب میں عبیدی نے توفیق کی دو غزلیں بھی نقل کی ہیں ۔ جب ۱۸۷۴ء میں عبیدی کو مدرسہ عالیہ (ڈھاکہ) کا ایک اہم رکن نامزد کر کے ڈھاکہ بھیجا جا رہا تھا توفیق نے ان کی شان میں ایک عمدہ قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے نے عبیدی کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اسے ''داستان عبرت بار'' میں شامل کر لیا۔ یہ کتاب بقول ڈاکٹر منصور عالم ابھی تک مخطوطے کی شکل میں ہے۔ ان کے بقول'' توفیق پیکر اخلاص و محبت تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق علم دوستی، سخن فہمی اور نکتہ سنجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں''۔ تذکروں میں جہاں ان کی شاعرانہ حیثیت بیان کی گئی ہے وہیں ان کے کردار و شخصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ لالہ سری رام نے اپنی کتاب ''خمخانۂ جاوید'' میں جس کا ایک نام ''تذکرہ ہزار داستان'' بھی ہے توفیق کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''خدا کے فضل سے حضرت توفیق اپنے والد ماجد کی مانند علم و فضل و اخلاق حمیدہ اور صفات برگزیدہ رکھتے تھے اور نکتہ سنجی اور موزونی طبع میں فخر خاندان تھے۔ تاریخ خوب کہتے تھے.......... غالب کے دوستانہ تعلقات ان کیساتھ مربوط تھے۔ نظم و نثر فارسی اردو دونوں میں دستگاہ تھی۔ چنانچہ دیوان ہزبر کی تقریظ و تاریخ خوب کہی ہے۔

مالک رام نے بھی ''اردوئے معلیٰ'' کے حصہ اول اور دوم میں شائع شدہ غالب کے پانچ خطوط کی روشنی میں توفیق کو ان کا شاگرد بتایا ہے۔ غالب کی توفیق سے بڑی محبت تھی اور وہ اپنے اس شاگرد پر ناز کرتے تھے۔

انھوں نے توفیق کے پاس اپنا نثری مجموعہ ارسال کیا تو اس کے ساتھ چند اشعار بھی تبرکاً بھیجے۔ ملاحظہ ہو:

آه کہ آمیختند باگل من بہر تو
داد کہ انگیختند از دل تو کین من
تیرہ دل از غم شدہ بادۂ روشن کجاست
صاف تراز شعر من پاک تراز دینِ من
کرد مرا تر دماغ نامۂ مشکین او
کز صفش عاجز است خانۂ مسکین من
شعر چو شعرای او دیدم و از فرط شوق
بر رخ من شدرواں اشک چو پروین من
کلک شکر ریز او گرمی شوقم شناخت
شربتی از قند ساخت ازپی تسکین ِ من
وصف تو کوھی بود خامۂ من تیشہ ای
سہل نہ بود وھی کوہ بہ متین من
شاہد فکر ترا ست حسنِ خداداد بس
درخور حسنش کجاست زیور تحسین من

سید نور احسن نے توفیق کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن سے فن شعر گوئی میں ان کی قابلیت اور مہارت و پختگی کا پتا چلتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔ (نگارستان سخن، بھوپال،۱۸۷۶ء،ص:۱۹)

دل آزادہء داری ازین خوشتر چہ می خواہی
درونی سادہء داری ازین خوشتر چہ می خواہی
لرزید سرشک و ریخت از جوش دلم آر
سیماب چوشد جو شان می لرزد و می ریزد
می غلتد و می لرزد تا بررخ او کامل

زین دیدہ در غلطان می لرزد و می ریزد

تا گوہر دندانش درخندہ نمایاں شد

از دیدۂ من مرجان می لرزد و می ریزد

توفیق کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خیال کی بلندی، زبان کی سلاست، روانی اور شوخی محاورے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ یہ تمام خصوصیات انھیں مرزا غالب جیسے استاد کامل سے عطا ہوئی تھیں۔

خانوادۂ ٹیپو کا یہ سپوت ایک مدت تک علم و فن کے خزانے لٹانے کے بعد ۱۸۸۵ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ نساخ نے تاریخ وفات لکھی۔

رفت شہزادہ بشیرالدین از جہان

سوی خُلد و داغِ خویش در دلہا سپرد

زد رقم سالِ رحلتش کلکِ نساخِ حزین

وای ! شہزادہ بشیرالدین مرد

دوسری تاریخ بھی کہی۔

رونق فردوس توفیق .... (۱۳۰۲ھ)

شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے ایک اور فرد سلطان صاحبزادہ اعظم الدین سلطان نواسہ ٹیپو سلطان کو بھی اہمیت دی ہے۔ عبدالغفور نساخ نے ''سخن شعراء'' میں لکھا ہے کہ سلطان کا فارسی دیوان بھی ہے اور یہ کہ سلطان ان کے دوستوں میں ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی لکھا ہے کہ سلطان کا فارسی دیوان کلکتہ میں چھپ چکا ہے جو غلط ہے کیونکہ بشیرالدین توفیق، ٹیپو سلطان کے بیٹے شکراللہ کے فرزند تھے۔ مولانا آزاد نے سلطان کو مولوی عبدالرحیم تمنا گورکھپوری کا شاگرد بتایا ہے۔ نساخ نے بھی اپنی سوانح عمری میں اس کا ذکر کیا ہے کہ شہزادہ اعظم الدین سلطان، عبدالرحیم گورکھپوری کے شاگرد ہوئے تھے۔ یہ وہی عبدالرحیم گورکھپوری ہیں جن کو نساخ نے ''گورکھپور کا جولاہا زادہ'' اور''

دہریہ'' لکھا ہے لیکن ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ وہ ''خصوصاً زبان پارسی کو خوب اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے علم کا شہرہ تھا''۔

نساخ نے تذکرہ ''سخن شعراء'' میں اردو نمونہ کلام کے طور پر سلطان اعظم الدین کا صرف حسب ذیل شعر پیش کیا ہے۔

داغوں سے غم کے رشک چمن ہے فضائے دل
ہے جائے سیر یہ چمن دلکشائے دل

ڈاکٹر منصور عالم لکھتے ہیں:

''پیکر علم و دانش، حرکت و عمل کا اعلیٰ ترین نمونہ، ادبی اور تہذیبی زندگی کی متحرک علامت، فخر روزگار شہزادہ اعظم الدین، متخلص بہ سلطان، ٹیپو گھرانے کے ایک ایسے فرد تھے جنھیں شعر و سخن کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ وہ نہ صرف فارسی زبان و ادب کے ایک جید عالم تھے، بلکہ اس زبان کے ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے بھی تسلیم کیے جاتے تھے''

عبیدی نے، جو اعظم الدین کے مصاحبین میں سے تھے، ان کے صاحب دیوان ہونے کی تصدیق کی ہے۔ نساخ نے اپنی خود نوشت میں اس شاعر بے مثال کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ سلطان صاحب فارسی دیوان ہے۔ مولانا آزاد نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اعظم الدین کا فارسی دیوان کلکتہ میں شائع ہو چکا ہے۔ نساخ ان کی شاعری سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''اخلاق کریمش خجستہ ہمایون، کلام فصیح، صاف و شستہ و خوش مضمون''۔

جب کہ نور الحسن نے یوں لکھا ہے:

''سخنش لطیف و کلامش نیکو''

انیسویں صدی کے نصف آخر میں فارسی کا زور کم ہونے لگا تھا۔ ۳۸-۱۸۳۷ء

کے ایک سرکاری حکم نامے نے فارسی کی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور اس کی جگہ اردو نے لے لی۔ انگریزی حکام اردو زبان کے پرستار نہیں تھے بلکہ یہ حکمران طبقہ فارسی کو ختم کر دینا چاہتا تھا تا کہ مسلمانوں کے اقتدار کی یہ بچی کھچی نشانی ختم ہو جائے اور کہیں فارسی انھیں یاد نہ دلائے کہ کبھی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی سازش کے تحت فارسی کا جنازہ نکالا گیا۔ لہذا رفتہ رفتہ اس کا اثر و نفوذ کم ہونے لگا۔ شعراء نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شاعری شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ لیکن ایسا ابھی نہیں ہوا کہ فارسی جو ایک طویل عرصے تک عوام کے دلوں پر راج کرتی رہی تھی، یکسر ختم ہو گئی۔ نساخ نے سلطان کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ فارسی میں شاعری ہو رہی تھی اور خوب ہو رہی تھی۔ سلطان کے اشعار دیکھیے: ؎

شد غلط راہ چہ سازم چہ کنم
گشت بیگاہ چہ سازم چہ کنم
آفتابم بہ لب بام آمد
نآمد آن ماہ چہ سازم چہ کنم
راز گیتی زکہ پرسم کہ کسی
نیست آگاہ چہ سازم چہ کنم

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عشق آمد و آزمود مارا
غم برسر غم فزود مارا
بگداخت دل حزین و از چشم
صد چشمہ خون کشود مارا

آئینہ دل چو گشت روشن
حق ز آئینہ رخ نمود مارا

یہ بھی دیکھیے:

مژہ بگشود یار دید مرا
برسر خاک و خس کشید مرا
داشتم چشم مرھمی از دوست
چشم زخمی از آں رسید مرا
کرد از تیغ جور از سلطان
شاہد کافری شہید مرا

شانتی رنجن کے نزدیک ایک اور فرد محمد شاہ عالم کا تعلق بھی شاہی گھرانے سے تھا۔عبدالغفور نساخ نے صرف اتنا ہی لکھا ہے:

''عالم تخلص، صاجزادہ محمد شاہ عالم خلف شاہزادہ غلام محمد ابن ٹیپو سلطان باشندہ ٹالی گنج متعلق کلکتہ۔شاگرد مولوی نجم الدین حسین نادر''

یار کے گویا دہان تنگ میں دندان ہے یہ
غنچہ گل میں مسلسل دانۂ شبنم نہیں
کیا عجب گلریز آتش بارشاخ گل کی طرح
ہاتھ میں تیرے جو اے رشک بہاراں سبز ہو

ایک اور اردو شاعر محمد کاظم شاہ کاظم بھی ٹالی گنج میسور یہ گھرانے کے فرد تھے اور ان کا دولت کدہ پرنس رحیم الدین لین ٹالی گنج میں تھا۔ان کی دو تصانیف کا علم ہوا لیکن اب تک یہ تصانیف کسی بھی کتب خانے میں نہیں ملیں۔ ان دونوں تصانیف میں پہلی ''دیوان کاظم معروف بہ خزینہ نعت'' ہے جسے خود مصنف نے نمبر۱۳۲ ہریسن روڈ کلکتہ سے

چھپوا کر ٹالی گنج سے ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء شائع کیا تھا۔ دوسری تصنیف کا نام ''قوالی کاظم'' ہے جو سعیدی پریس نمبر ۹۴ کلنگا بازار کلکتہ میں چھپی تھی اور جسے مصنف نے پرنس رحیم الدین لیین ٹالی گنج یعنی اپنے دولت کدہ ہی سے ۲۷ جنوری ۱۹۱۰ء کو دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا تھا۔

شانتی رنجن کے نزدیک محمد یاسین معین بھی ٹیپو سلطان کے خلف تھے اور نواب غلام ربانی افسر کے شاگرد تھے۔ آپ نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی پشت پناہی بھی خوب کرتے تھے۔ نوشاد نوری نے ایک مضمون ''ادب اور سرپرستی'' میں لکھا ہے کہ صاحبزادہ محمد لیسین نے قطب الدین باطن کو نذرانے اور عطیے دیے تھے۔ مزید حالات کا علم نہیں۔ نمونہ کلام:۔

مشک افشاں جو تھے سینہ پہ یہ گیسو میرے
زخمِ دل اور ہرے ہو گئے گلرو میرے

ڈاکٹر منصور عالم لکھتے ہیں:

شہزادہ اعظم الدین سلطان کے بعد بھی خانوادہ ٹیپو کا علمی و ادبی سفر جاری رہا۔ ان کی وفات کے بعد سلطان شہید کا ایک نواسہ رحیم الدین کلکتہ کے آسمان علم وادب پر نمودار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے شعر وادب کی دنیا پر چھا گئے۔ ان کی تعلیم وتربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں شعر و شاعری رگ وپے میں سما جاتی ہے۔ اس دور میں مشاہیر علم وادب کی ہم نشینی میں ہمہ وقت رہنے والے اس شاعر کو شاعری کے تمام رموز ونکات سے مکمل آگہی تھی۔ وہ بیک وقت ایک کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز انشاء پرداز، فارسی زبان کے عالم اور صرف ونحو کے ماہر تھے۔ انہی خصوصیات کی بنیاد پر وہ اپنے معاصرین اور رفقاء کے محبوب نظر تھے''۔

چنانچہ نساخ جیسے شاعر اور ادیب بھی ان کی شاعری اور شخصیت کے پرستار تھے۔ نساخ لکھتے ہیں:۔

''رحیم ، فکر بلند و طبعِ ارجمند دارد''

شہزادہ رحیم الدین کی پرورش و پرداخت چونکہ مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے وہ نعتیہ کلام پسند کرتے تھے اور نعت کہا کرتے تھے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ نعتوں پر مشتمل ہے اور ''ہفت بند'' کے عنوان سے ۱۸۸۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

نعت کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

السلام ای پادشاہ و سرور دنیا و دین
السلام ای ذات پاک نور العالمین
آنچہ از توقیر و عزت شد سلیمان را نصیب
ہمہ بہ فیض صورت تصغیر شناست

رحیم الدین کی علمی، ادبی اور سماجی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب انگریزی حکام نے ہگلی مدرسہ کے قیام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کی تو شہزادہ رحیم الدین کو اس کا ایک اہم رکن نامزد کیا۔ انھوں نے اس کمیٹی کے کئی جلسوں کی صدارت بھی کی۔ ان کی فیاضی اور علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ایک تقریب میں مسلم طلبہ کے لیے ایک ہزار روپیہ بطور ہدیہ پیش کیا۔

سلطان ٹیپو کے نواسوں میں شہزادہ محمد جلال الدین کی شخصیت مختلف خصوصیات کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک پختہ اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ صاحب طرز انشا پرداز، نکتہ بین محقق، اعتدال پسند ناقد، فارسی کے علاوہ انگریزی زبان کے ماہر بھی تھے۔ ان کی محفلوں میں اصحاب علم و فن شریک ہو کر مختلف علمی و ادبی اور سماجی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ شہزادہ ان مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے جس سے ان کی علمی بصیرت اور نقد و نظر کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا عبیدی جب تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر کلکتہ آئے تو ملازمت کے لیے سیدھے شہزادہ جلال الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شہزادہ موصوف نے انھیں اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ عبیدی ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

شہزادے کی سفارش سے عبیدی کو کئی جلیل القدر عہدے بھی نصیب ہوئے۔ انھوں نے جلال الدین کی فرمائش پر سنسکرت کے کچھ اشعار کو فارسی کا جامہ عطا کیا۔ شانتی رنجن لکھتے ہیں کہ ''افسوس کا مقام ہے کہ شہزادہ جیسے بہترین شاعروادیب کی تخلیقات استبداد زمانے کا شکار ہوکر تلف ہوگئیں''۔

مختلف تذکروں اور تاریخ ادبیات کو کھنگالنے کے بعد شہزادہ جلال الدین کے بعد ٹیپو خاندان کا دوسرا کوئی بلند قامت شخص نظر نہیں آتا جس نے سلطان شہیدؒ کی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس خاندان نے علم وادب کے میدان سے بن باس لے لیا۔ نواب نزہت جنگ بیخود، آغا سلطان وحید الدین حیدر، نواب محمد شاہ عرف پیارے، خواجہ محمد ابراہیم رسا، سلطان غلام محمد شاہ عالم، شہزادہ غلام محمد ابن ٹیپو سلطان، محمد کاظم علی شاہ کاظم، شاہزادہ احمد شاہ کیوان شاگرد نظم طباطبائی وغیرہ سلطان ٹیپو کی علمی وادبی روایات کو آگے بڑھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس چراغ کی لو کو مدھم نہیں ہونے دیا جسے کبھی ٹیپو نے روشن ومنور کیا تھا۔

شانتی رنجن کے نزدیک محمد ابراہیم رسا ایک اہم اردو شاعر تھے۔ وہ پہلے مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد تھے اور بعد میں وہ حضرت نادر شاہ خان شوخی رامپوری کو اپنا کلام دکھاتے رہے ہیں۔ رسا نے دیوان ملکہ جان ملکہ ''مخزنِ الفت ملکہ ۱۳۰۳ھ'' مطابق ۱۸۸۶ء کی جو تقریظ لکھی ہے اس میں انھیں ''تلمیذ حضرت شوخی'' لکھا گیا ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ۱۸۸۶ء سے پہلے ہی رسا شوخی رامپوری کے شاگرد تھے۔

رسا کب پیدا ہوئے اور کب ان کا انتقال ہوا، اس کا علم حاصل نہیں لیکن لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ ''۱۸۸۰ء میں تیس برس کی عمر تھی'' اس لحاظ سے ان کا سن ولادت ۱۸۵۰ء ہوتا ہے۔ رسا کا ایک مختصر مجموعۂ کلام ''آہ رسا'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ربن پریس نمبر ۶ رام پرساد ساہا لین میں چھپ کر سندریہ پٹی کلکتہ سے ۱۹ جولائی

۱۸۸۶ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کے صفحات ۱۶ تھے اور بار اول اس کی تعداد ۲۵۰ کا پیاں رہی ہیں۔ حالانکہ اس مجموعے کی قیمت ایک آنہ رکھی گئی تھی۔ یہ نظم رسا نے کسی طوائف کے عشق میں کہی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر وہ کون سی طوائف تھی جس کے لیے رسا نے یہ آہ بھری ہے لیکن بھٹا چاریہ کے نزدیک'' وہ ملکہ جان ملکہ کے عشق میں کہی گئی ہو گی جو ان دنوں بنارس سے کلکتہ میں آکر بس گئی تھی اور ان دنوں کلکتہ کی سب سے مشہور طوائف تھی۔ وہ گوہر جان گوہر کلکتہ والی کی ماں تھی''۔

مشاعرہ ٹالی گنج ۱۸۸۳ء میں رسا نے جو غزل پڑھی تھی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رُخ سے دامن تلک آجاتے ہیں غلطاں ہوکر
دیکھ لو گوہر شہوار ہیں آنسو میرے
بس گئی کاکُلِ شب رنگ کی خوشبو ان میں
رات بھر میں ہوئے تکیے گل شبو میرے
ان کے دامن تلک اب ہاتھ پہنچنا ہے محال
جن کی گردن کے تلے رہتے تھے بازو میرے

اردو کے ایک اور شاعر صاحبزادہ احمد شاہ کیوان تھے۔ خاندان میسور یہ ٹالی گنج کے فرد تھے۔ نظم طباطبائی کے شاگرد تھے۔ مزید حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ نمونہ کلام:۔

رات دن اے صنم آغوش میں ہو تو میرے
یہ تمنا ہے سدا گرم ہوں پہلو میرے
یاد میں گوہر دندان کی شب فرقت میں
مثل نیساں کے برس جاتے ہیں آنسو میرے
کھینچا رہتا ہے سدا مثل گریباں مجھ سے
نہیں ملنے کا گلے ، وہ بت بدخو میرے

زلفِ مشکیں کا جو اس گل کے لیا تھا بوسہ
مشک نافہ کی دہن میں ہوئی خوشبو میرے
شیر ہو کر نظر آیا اسے سایہ اپنا
چوکڑی بھول گیا دشت میں آہو میرے

نواب غلام ربانی افسر ٹالی گنج کے میسور گھرانے یعنی شہید ٹیپو سلطان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ ٹیپو سلطان کے بھتیجے ہوتے تھے اور غالباً کریم شاہ بہادر کے فرزند تھے۔ گلدستہ ''نتیجہ سخن'' کلکتہ، جون ۱۸۸۳ء میں افسر صاحب کے مکان پر ماہانہ مشاعرے کی روئیداد شائع کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''عالی جناب فیضیاب نواب غلام ربانی صاحب مدظلہ تعالی، متخلص بہ افسر از خاندان ٹیپو سلطان جنت آرام گاہ کے دولت خانہ پر ایک مشاعرہ ماہ بماہ واقع ٹالی گنج ہوتا ہے۔ چنانچہ اول مشاعرہ کی غزلیں گلدستہ سابق میں ہدیۂ ناظر ہو چکے ہیں اور مشاعرہ حال جو بہ تحریک معاونان والا شان قدردانِ گلدستہ جناب شاعر سخن پرور مولوی سید علی حیدر صاحب متخلص بہ حیدر مدظلہ، و جناب آغا مرزا علی صاحب نجم و جناب نواب محمد شاہ صاحب عرف پیارے صاحب متخلص بہ خواجہ، بہ پاس شرکت جناب نادر شاہ خاں متخلص بہ شوخی مدظلہ شاگرد حضرت اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالب دہلوی مرحوم کے، جس کی طرح ع '' دیکھ لوگو ہر شہوار میں آنسو میرے'' منعقد ہوا تھا اور اس بزم مشاعرہ میں حضرات شعراء و امراء مٹیا برج، ٹالی گنج، کلکتہ، شریک ہوئے تھے اور جن حضرات نے اپنی اپنی غزلیں مسرت افزا گوش سامعین فرمائی تھیں وہ کل غزلیں گلدستہ ہذا میں واسطے ملاحظہ ناظرین درج کی جاتی ہیں.........''

افسر ''کمیٹی انتظامی اسلامیہ مجلسِ مذاکرہ علمیہ کلکتہ ۱۸۶۳ء'' کے ایک معزز رکن

تھے ۔ اس کے دو نائب صدر بھی میسور یہ گھرانے کے شاہزادے، محمد نصر الدین حیدر اور شاہزادہ محمد بختیار شاہ رہے تھے ۔ یہی وہ مجلس مذاکرہ علمیہ اسلامیہ ہے جس کے میر مجلس نواب عبداللطیف خان بہادر برورا کبر عبدالغفور خاں نساخ تھے ۔ اس مجلس کی طرف سے ایک ماہنامہ ''انجمن اسلامیہ'' کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ افسر کو استادِ سخن ہونے کا اشرف بھی حاصل تھا۔ ان کے شاگردوں میں صاحبزادہ محمد یٰسین معین بھی میسور گھرانے کے فرد رہے ہیں ۔ شانتی رنجن کے خیال میں افسر، جناب نادر شاہ خان شوخی رامپوری کے شاگرد تھے جو ٹالی گنج کے نوابوں سے بہت قریب رہے اور ٹالی گنج میں مقیم رہے ۔ نمونہ کے طور پر حسب ذیل چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

خط نکل آئے ترے شعلہ سے رخساروں پر
یہ تماشا ہے دھواں جم گیا انگاروں پر
مٹ گئے اشک کے مانند نکل کے گھر سے
سخت مشکل ہے سفر تیرے طلبگاروں پر

آغا سلطان وحید الدین حیدر کا تعلق بھی ٹالی گنج کے ٹیپو سلطان گھرانے سے رہا ہے، جو ٹالی گنج سے نکل کر نہ معلوم کب اور کیوں صوبہ بہار کے آرا میں جا بسے تھے ۔ حیدر کے سلسلے میں بقول شانتی رنجن بھٹا چاریہ جناب عارف مارہروی آروی مصنف '' آرا، ایک شہرِ سخن'' لکھتے ہیں:

'' آغا سلطان وحید الدین حیدر کے والد آغا سلطان تفضل حسین ابن آغا سلطان وجیہہ الدین حیدر ولد آغا سلطان اسمٰعیل علی بن آغا سلطان فتح حیدر ابن ٹیپو سلطان تھے ۔ آپ کی ولادت یکم جولائی ۱۸۸۴ء کو ہوئی ۔ ۱۹۲۰ء میں آرا ضلع سکول سے میٹرک کیا۔ ۱۹۲۲ء میں عارضی سب رجسٹرار مقرر ہوئے ۔ پورنیہ، دمکا موتی ہاری، در بھنگا، چھپرہ، مظفر پور ہوتے ہوئے ۱۹۴۴ء میں پٹنہ تبادلہ ہوا، اور ۱۹۴۷ء میں پٹنہ سے آرا آ

گئے ۔آرا میں یکم جولائی ۱۹۵۰ تک ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار کے عہدہ پر فائز رہے۔ دوران ملازمت آرا جین سکول کے شمالی والی گلی میں جسے گوالا محلہ کہتے ہیں۔کرایہ کے مکان میں رہے۔ریٹائر ہوکر چودھرانہ میں چودھری عمر صاحب کے مکان میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں گگھیا ٹولی میں سید صابر حسین صابر آروی کے آبائی مکان کے نزدیک شیعہ امام باڑہ کے سامنے والے مکان میں منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۹۷۶ء میں وفات پائی ۔یعنی آپ نے ۸۲ برس کی طویل عمر پائی ۔آپ کے بھائی آغا وصی حیدر صاحب تھے۔حافظہ غضب کا تھا۔آرا کے بے شمار شعراء کا کلام ازبر تھا۔سخن فہم وسخن سنج تھے ۔حضرت بدر آروی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔آپ کے معاصرین اور دوستوں میں سید خادم حسین صاحب خادم آروی، چودھری محفوظ عالم اور والد بزرگوار تھے''۔

''مقالات فرید'' میں ہے کہ ٹیپو سلطان کے موجودہ ورثاء میں محمد حسین شاہ اور ان کے بھائی بچے ہیں جو سرکلر روڈ پر کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔یہ انور شاہ بن منیر الدین بن ٹیپو سلطان کے پڑپوتے ہیں۔ٹیپو سلطان کے چھوٹے بھائی کریم شاہ کی اولاد میں مقبول عالم اور سید عالم کے بال بچے ٹالی گنج اور دوسرے رشتہ دار چتلا (خضر پور) اور دیگر محلوں میں آج بھی زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور ان سبھوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔انتہائی دکھ کی بات ہے کہ جن کے اجداد نے کروڑوں روپے کی جائیدادیں چھوڑیں ،ان کے ورثاء کا حصہ محض برائے نام ہے۔افسوس ہے کہ آپس کی نااتفاقی اور خودغرضی اور نفاق نے خاندان کو برباد کردیا ہے اور دوسرے لوگ ان کی جائیدادوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں''۔

(مطبوعہ ''اجالا'' کلکتہ بابت ۲ ستمبر ۱۹۸۱ء مشمولہ مقالات فرید)

ٹیپو کے خانوادے کے ایک رکن میجر ابراہیم کا ذکر میری کتاب سلطان شہید میں

دیباچے سے لے کر اکثر آیا ہے۔ وہ پاکستان کے واحد شخص ہیں جن کے پاس ٹیپو سے متعلق ادبیات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور ان کے بیشتر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اب خانوادۂ "ٹیپو" بکھر چکا ہے اور یقیناً اپنے اس عظیم جدامجد کے کارناموں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ عملاً تو برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمان اس کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اس عظیم بزرگ کے احسانات کو یاد رکھنا پوری امتِ مسلمہ کا فرض ہے۔ دیکھیں وہ یہ فرض کیسے ادا کرتی ہے۔